سلسلہ مطبوعات (۵۱)

# عزیمت

سیریز ۳

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

# عزیمت

**مجلس ادارت**

مولانا مفتی عبدالخالق آزاد

مولانا مفتی عبدالقدیر

مولانا مفتی عبدالغنی قاسمی

مقصودالحسن چوہدری

**مدیر اعلیٰ**

ڈاکٹر مفتی

**سعیدالرحمن**

## پیش کش


| | | |
|---|---|---|
| مطالعہ سیرت کی ضرورت واہمیت | ڈاکٹر مفتی سعیدالرحمن | 3 |
| شیخ الہند شخصیت وکردار | مفتی شہاب الدین بنگش | 13 |



شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

# مطالعۂ سیرت کی ضرورت واہمیت

(درج ذیل خیالات کا اظہار ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن نے 26 جون 2000ء کو مانسہرہ میں شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار میں کیا، جس کو جناب محمد امتیاز نے قلمبند کیا اور مفتی نصر اللہ ناصر نے اس کو ترتیب دیا۔ ان احباب کے شکریہ کے ساتھ ہدیہ قارئین ہے۔ (ادارہ)

جناب صدر مجلس اور معزز حاضرین! اسلام کی تعلیمات کی صحیح شکل اور اس کی سچی روح اسی وقت ہمارے سامنے آتی ہے جب ہم سیرت النبی ﷺ سے واقف ہوں۔ لہذا مطالعۂ سیرت ہماری عملی زندگی کی ایک بڑی بنیادی ضرورت ہے۔ جس کے بغیر دین کا سمجھنا بالخصوص قرآن حکیم کی روح تک رسائی حاصل کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم اور سیرت النبی ﷺ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور جب بھی ان میں علیحدگی کی کوشش کی جائے گی تو نتیجتاً دین کی بنیادی تعلیمات مسخ ہو کر رہ جائیں گی۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ نظریہ عہد زوال میں رونما ہوا کہ قرآن حکیم کو سیاست سے علیحدہ کر دیا جائے اور اس نظریہ کے پس منظر میں یہ سوچ کارفرما ہے کہ قرآن حکیم کو سمجھنے کیلئے سیرت کا جاننا کوئی ضروری چیز نہیں۔

## یورپ کے مستشرقین کا رویہ:

یورپ میں ایسے سکالرز موجود ہیں جن کے بارے میں بظاہر تاثر یہ ہے کہ یہ کسی بھی چیز کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں یہ علم کے رسیا اور حقیقت کے متلاشی ہیں اور انہوں نے دین اسلام، قرآن، حدیث اور دیگر علوم کو اپنی تحقیق کا میدان چنا ہوا ہے۔ لیکن ان کی تمام تر تحقیقات کا مقصد یہ ہے کہ ایسے افکار اور نظریات پیدا کئے جائیں جن سے مسلم نوجوانوں میں شکوک وشبہات کی فضا پیدا ہو جائے۔ ان کیلئے یورپ میں کثیر بجٹ مختص کیا جاتا ہے تاکہ وہ اسلام پر تحقیق کریں۔ حالانکہ یورپ کے مقتدر طبقہ کو دین اسلام سے کبھی ہمدردی نہیں رہی۔ دین اسلام کے ساتھ تو اس کی مخاصمت و عداوت کی بڑی پرانی تاریخ ہے۔ چنانچہ ہماری تاریخ میں صلیبی جنگیں بڑے مشہور واقعہ کی حیثیت رکھتی ہیں کہ جب بیت المقدس کے حصول کے لئے یورپ میں مذہبی جنون پیدا کیا گیا اور اس کیلئے یورپ کے نوجوانوں کو اکٹھا کیا گیا اور کہا گیا کہ یہ ہمارے مذہب اور صلیب کو بچانے کی جنگ ہے اور اگر مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدم نہ روکے گئے تو صلیب کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔

(ان صلیبی جنگوں کے حوالے سے بڑا مشہور کردار سلطان صلاح الدین ایوبی اور سلطان نور الدین زنگی کا ہے کہ جنہوں نے اس دور میں ان جنگوں میں متعصب عیسائیوں کا نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ بڑی حکمتِ عملی، دانائی اور بہادری کے ساتھ اس جنگ کو جیتا)

صلیبی جنگوں کی نفسیات ان جنگوں کے خاتمے کے باوجود آج بھی موجود ہے۔ شکلیں تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ آج گرم کی جگہ سرد اور اسلحے کی جگہ لٹریچر اور میڈیا کی جنگ نے لے لی ہے۔ جبکہ مقاصد وہی ہیں چنانچہ یہ مستشرقین اسی نقطہ نظر کے تحت ایسا لٹریچر تیار کرتے ہیں جن کا بنیادی مقصد مسلم نوجوانوں کو اپنے دینی ورثے سے لاتعلق کرنا اور ان کے ذہن میں شکوک و شبہات کی ایسی فضا پیدا کرنا ہے کہ وہ اس دین کے حوالے سے کسی موثر کردار کیلئے قطعاً نہ سوچیں اور پھر وہی لٹریچر مسلم دنیا میں آتا ہے۔

## سیرت وسنت کے انکار کا نتیجہ:

ہمارے ہاں کچھ لکھنے والے اس لٹریچر سے متاثر ہوتے ہیں انہی کی باتوں کی جگالی کرتے ہیں۔ انہی کے خیالات کو وہ اپنے قلم سے پیش کرتے ہیں اور یوں ان کی نمائندگی ہمارے پسماندہ معاشرے میں ہوتی رہتی ہے۔ بہر حال سامراجی مستشرقین کے بہت سے اہداف میں سے ایک بڑا بنیادی ہدف قرآن حکیم اور دین اسلام کو سیرت النبی ﷺ سے علیحدہ کرنا ہے تا کہ اس کے بعد جو بھی من مانی تعبیر بنے وہ پیش کر دی جائے۔ چنانچہ پاکستان میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی باقاعدہ سرکاری سرپرستی کی گئی ہے اور ان سے یہ لٹریچر لکھوایا گیا کہ قرآن کو سمجھنے کیلئے کسی طور سیرت کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی بناء پر خیر القرون کے تصور کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور پھر اس کے نتیجے میں اس سوچ کو فروغ دیا گیا کہ ہم حالات کے دھارے میں بہہ کر قرآن حکیم کی کوئی بھی تعبیر کر سکتے ہیں اور یوں ہمارے ہاں انکار سنت وحدیث کو باقاعدہ پروان چڑھایا گیا۔ یورپ کے میڈیا کے ذریعہ ایسے لوگوں کی تشہیر کی گئی۔ ان کے لٹریچر کو یورپ میں کافی تعداد میں منگوایا گیا اور خریدا گیا۔ پھر حکومتی سطح پر بھی ایسے لوگوں کو کوریج دی گئی۔ نوجوانوں کو ان سے متعارف کرانے کی کوشش کی گئی تا کہ قرآن حکیم کو استحصالی یورپ کے مفادات سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا جائے۔ اس ہم آہنگی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس بنیادی سپرٹ سے کہ معاشرے کے اندر بنیادی تبدیلی لانے کیلئے ایک ایسی نئی نسل پروان چڑھائی جائے جو دنیا کے اندر بڑا اہم اور بنیادی انقلابی کردار ادا کرے قرآن حکیم کو علیحدہ کر دیا جائے اور اس کی روح کو ختم کر دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کی حقیقی روح کا تعارف سیرت النبیؐ سے ہی ہو سکتا ہے کہ ہم اس بابت مطالعہ کرتے ہیں کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوتا رہا ہے اس دور میں اس نے سوسائٹی میں کیا تبدیلی پیدا کی ہے۔ اگر ہم اس سوسائٹی اور معاشرے سے واقف نہیں ہوتے تو قرآن پاک کی عملی اپیل ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم کی بنیادی

اپیل ہمہ جہت تبدیلی ہے اور یہ روایتی تعلیمات اور محض اجر وثواب کے نظریہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ ایسی ہمہ گیر تعلیمات ہیں جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام دائروں کا احاطہ کرتی ہے اس لئے مطالعہ قرآن کیلئے مطالعۂ سیرت لازمی قرار پاتا ہے اور اگر سیرت النبیؐ کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو پھر قرآن حکیم کی نوعیت وہی بن جائے گی جو اس دور میں دنیا کی باقی مذہبی کتابوں کی ہے۔ آج دنیا میں توریت اور انجیل نام کے صحیفے موجود ہیں اسی طرح دیگر مذاہب کی کچھ نہ کچھ تعلیمات کتابی شکل میں موجود ہیں لیکن یہ تمام کتابیں معاشرے میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنے کیلئے کوئی راہ نہیں سمجھاتیں اور نہ یہ جذبہ پیدا کرتی ہیں اور اگر قرآن حکیم کو بھی اسی صف میں لا کھڑا کر دیا گیا تو یقیناً یہ بہت بڑی ناانصافی ہوگی۔ اس لئے ضروری ہے کہ قرآن حکیم کے حوالے سے اس معاشرے کا مطالعہ کریں جس میں قرآن حکیم کا نزول اگرچہ 23 برسوں میں مکمل ہوا لیکن اس کی تعلیمات میں اتنی جان موجود تھی کہ اس نے آغاز نزول سے جو عمل شروع کیا وہ معاشرے میں تبدیلی اور ایک انقلاب برپا کر دینے کا عمل تھا اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کو دنیا کی کوئی تاریخ جھٹلا نہیں سکتی۔

## ہجرت حبشہ کے پس منظر میں مطالعۂ سیرت:

مثلاً حضور اکرم ﷺ کے عہد میں وہ بہت مشکل وقت تھا جب مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کیلئے عرصہ حیات تنگ ہو گیا اور ان کیلئے اس معاشرہ میں جینا مشکل ہو گیا۔ تو آپؐ نے اس بات کی اجازت دے دی کہ جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں ان کے لئے چونکہ حالات زیادہ پریشان کن ہیں لہذا وہ کچھ وقت کیلئے اس تنگ و تاریک ماحول سے ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ مسلمان ہجرت حبشہ کرتے ہیں۔ لیکن ہجرت حبشہ کے باوجود قریش مکہ کو اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ اب یہی چیز سوچنے کی ہے کہ قریش کو جو مکہ کے سردار ہیں کیا بے چینی ہے حالانکہ صحابہ کرام نے حبشہ میں جا کر کوئی حکومت نہیں بنائی بلکہ وہ محض چند خاندان تھے۔ جو وہاں چلے آئے تھے۔ اس بے چینی کا

اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ چیز سمجھ میں آتی ہے کہ قریش جانتے تھے کہ قرآن حکیم پر ان کی جو تربیت ہوئی ہے اور رسول اللہ کی صحبت کی وجہ سے ان میں ایک ایسا جذبہ اور ان کے پاس ایک ایسا عملی نمونہ موجود ہے جو دنیا کے اندر کسی بھی معاشرے میں تبدیلی لاسکتا ہے اور اگر ان کو وہاں پر نہ روکا گیا تو ایک وقت ایسا آئے گا یہ اس معاشرے میں تبدیلی لے آئیں گے اور اس کے نتیجے میں وہ تبدیلی کا عمل یہاں بھی پہنچ سکتا ہے چنانچہ ایلچی بھیجے جاتے ہیں۔ حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے گفتگو ہوتی ہے اور اس سے تقاضا کیا جاتا ہے کہ یہ بھگوڑے لوگ ہیں لہذا ان کو واپس کیا جائے۔ نجاشی اس مطالبہ کو فوری قبول یا مسترد کرنے کی بجائے یہ جواب دیتا ہے کہ جب تک دوسرے فریق کا موقف نہ سنا جائے فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ مسلمانوں کو نجاشی کے دربار میں بلایا جاتا ہے اور انہیں آگاہ کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ تمہیں لینے کیلئے آئے ہیں اس بنیاد پر کہ تم بھگوڑے ہو۔ بھگوڑوں کی واپسی کا مطالبہ ایک جائز مطالبہ ہے اس حوالہ سے تمہارا کیا موقف ہے؟ اس موقع پر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کا موقف پیش کیا انہوں نے پہلے تو زمانہ جاہلیت کے حالات کا ذکر کیا، کہ ہم مشرک تھے، قتل و غارت، سودی کاروبار، اپنی بچیوں کو زندہ درگور کر دینا ہمارا شیوہ تھا۔

اب یہ شخص (رسول اکرم ﷺ) آیا اور انہوں نے ہمیں حکم دیا کہ سب پر ایک اللہ کی بندگی اور اطاعت لازمی ہے۔ صرف رزق حلال کا اہتمام کرنا ہے اور انہوں نے رزق حرام کی تمام صورتوں کو ہمارے لئے بند کر دیا اور ہمارے دلوں میں انسانیت کی عظمت پیدا کی اور ہم میں چونکہ کچھ لوگ اپنی بچیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے اس لئے انہوں نے ہمیں اس بات کی تعلیم دی کہ یہ بھی انسان ہیں ان کی بھی عزت نفس ہے جس سے انہیں محروم نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے ہمیں صلہ رحمی کی طرف راغب کیا۔ ہمارے معاشرے کے اندر ظالم اور مظلوم کے حوالے سے جو تقسیم موجود تھی اس کو ختم کرنے کی دعوت دی۔ ہم ان باتوں پر ایمان لے آئے۔ یہ گفتگو نجاشی کے لئے دلچسپی کا باعث بنی۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کے پاس ایک ایسا دین اور نظریہ موجود ہے جو واقعتاً معاشرے کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ معاشرے کے اندر اونچ نیچ ختم کر کے اس میں

احساس انسانیت کو پیدا کرتا ہے اور جو معاشرے کے پسے ہوئے طبقوں میں یہ جذبہ بیدار کرتا ہے کہ وہ بھی معاشرے کا ایک لازمی اور اہم حصہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں ان کا پورا پورا حق ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کی صحبت اور تربیت کے نتیجے میں ایک چھوٹی سی جماعت حبشہ جیسے اجنبی ملک میں جا کر طاقت کے بل بوتے پر یا نجاشی پر دباؤ ڈال کر نہیں بلکہ اپنے نظریات اور اپنے کردار کی بنیاد پر یہ فیصلہ کروالیتی ہے کہ مسلمان جب تک یہاں رہنا چاہیں ان کو کوئی طاقت نہیں نکال سکتی۔ مطالعہ سیرت سے یہ بنیادی بات سامنے آتی ہے کہ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کے پاس وسائل کی کمی تھی اور ان کے پاس افرادی قوت اتنی زیادہ نہیں لیکن ایک اعلیٰ عقیدہ اور نظریہ کے حامل ہونے اور اس پر اعلیٰ تربیت کے ساتھ لیس ہونے کی وجہ سے انہوں نے دنیا کے بڑے بڑے نظاموں کو تبدیل کیا۔ اسی بنا پر یہ کہنا درست ہوگا کہ مطالعہ سیرت کے حوالے سے منفی اور فاسد سوچ کا بنیادی مقصد قرآن حکیم کو عمل سے الگ تھلگ رکھنا ہے۔

جب ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن حکیم محفوظ ہے تو اس کے محفوظ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اس کی اتنی جاندار اور پائیدار تعلیمات ہیں کہ معاشرہ کتنا ہی بگاڑ کا شکار ہو جائے یہ اس معاشرے کو خسارے سے نکال کر فائدے اور برائی سے اچھائی، ظلم سے عدل اور بددیانتی سے دیانت کی طرف لانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

## مطالعہ سیرت اور رسمیت کی منفیت:

سیرت کی معنویت اور تاثیر کو سبوتاژ کرنے کیلئے ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا ذکر چند تقریبات تک محدود کر دیا جائے اور اس کو پورے سال کا سلیبس اور پوری زندگی کا نصاب بنانے کی بجائے محدود کر کے چند ایام تک منحصر کر دیا جائے چنانچہ ان ایام میں بھی کچھ ایسے اعمال اپنا لئے گئے ہیں جن کا انفرادی و اجتماعی زندگی میں تبدیلی سے کوئی تعلق نہیں۔ ان ایام میں رسول اللہ ﷺ کی ذاتی خوبیاں کسی حد تک بیان کی جاتی ہیں لیکن آپ ﷺ کی سیرت اور آپ ﷺ کے کردار کے احیاء کے تقاضوں کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ جس کے نتیجے میں کیفیت یہ ہو چکی

ہے کہ مسلمان بھی کسی دوسرے مذہب کے ماننے والوں کی طرح اپنے بانی مذہب کا یوم ولادت منا لیتے ہیں جس میں چند تقریبات اور چند باتیں ہو جاتی ہیں اور اشیاء خورد ونوش کا اہتمام ہو جاتا ہے یوں وہ دن مکمل ہو جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ سیرت اس جاری عمل کا نام ہے جو رسول اللہ نے معاشرے کے اندر اختیار کیا۔ زمانہ امن اور زمانہ جنگ میں آپؐ نے جو کردار ادا کیا آپ نے اپنے ماننے والوں کے ساتھ جو برتاؤ رکھا اور اپنے نہ ماننے والوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا خارجہ پالیسی کے حوالے سے آپ نے جو اصول دیئے داخلی حکمت عملی کے حوالے سے آپ نے جو طریقہ اختیار کیا دنیا کے دیگر مذاہب کے ساتھ اور دیگر مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ آپؐ کا میل جول کس طرح ہوا۔ غرضیکہ پوری زندگی سیرت کہلاتی ہے آج اس سیرت سے ہمیں علیحدہ کر کے اس طرح کے مسائل موضوع بحث بنا دیئے گئے ہیں کہ کیا آپؐ بشر ہیں یا نور! آپ ہر جگہ موجود ہیں یا ہر جگہ موجود نہیں؟ کیا آپؐ علم غیب رکھتے تھے یا نہیں؟ یعنی وہ مسائل کہ جن کا عملی زندگی اور معاشرتی معاملات سے کوئی تعلق نہیں لیکن ان پر ہمارے درمیان میدان جنگ قائم ہو جاتا ہے۔ مسجدیں تقسیم ہو جاتی ہیں، علماء تقسیم ہو جاتے ہیں اس کے نتیجے میں معاشرے کے اندر بے عملی فروغ پاتی ہے۔ نوجوان سوچتا ہے کہ جو لوگ ابھی تک اپنے نبی کی حیثیت کا تعین ہی نہیں کر سکے وہ اگلا کام کیا کریں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے بحث ومباحثے چاہے کتنے خلوص سے کئے جائیں ان کے نتیجے میں معاشرے میں سوائے کنفیوژن، بددلی اور بے عملی کے کچھ نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے برعکس اگر ہم اس نقطہ نظر سے کام کریں کہ سیرت نبویؐ ایک جاری عمل اور معاشرے میں بنیادی تبدیلی لانے، ظلم کے خاتمے اور عدل کے قیام کی جہد مسلسل سے عبارت ہے تو اس سے معاشرے میں حیات اور تنظیم پیدا ہو سکتی ہے۔

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ جو حدیث اور فقہی علوم کے مستند ترین استاد اور امام ہیں ان کا زریں قول ہے جو ان کی پوری زندگی کے مطالعہ کا نچوڑ وخلاصہ سمجھا گیا ہے فرماتے ہیں **لا یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح به اولها۔** ''جب اس امت کے بعد کے حصے میں

اجتماعی فساد پیدا ہو جائے تو اس کی درستی کا راہ وہی ہوگا جو اس کے شروع کے حصے یعنی خیر القرون میں اپنایا گیا ہے"۔

لہذا آج جب تک سیرت سے استفادہ نہیں ہوگا، اس کی طرف رجوع نہ ہوگا اور اس کے مطابق دین کے غلبے کی جدوجہد نہیں ہوگی تو محض خود ساختہ طریقوں کے مطابق جدوجہد دینی جدوجہد نہیں کہلائے گی۔ دینی جدوجہد وہی کہلائے گی جو سیرت کے منہج اور مزاج پر ہو۔

## مطالعہ سیرت اور ہمہ گیر تبدیلی کی حکمت عملی:

رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے اپنے نظریات کا ابلاغ کیا۔ اپنی بات لوگوں تک پہنچائی۔ اس کے بارے میں لوگوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا۔ ان کے سامنے اس بنیادی نظریے کی حیثیت واضح کی۔ اس کے نتیجے میں افراد کے اندر بنیادی تبدیلی آ گئی مثلاً حضرت بلالؓ جیسا شخص جو کہ مستقل طور پر غلام ہے جس نے کبھی اپنے آقا کی بات کی خلاف ورزی نہیں کی لیکن جب وہ اسلام قبول کر لیتا ہے تو وہ خدا کے علاوہ کسی کی بندگی اور فرمانبرداری کو نہیں مانتا اس کا کہنا ہے کہ سب سے بڑا نظام اللہ کا ہے۔ بندگی اسی کی ہے، اطاعت اسی کی ہے۔ یہی وہ تبدیلی ہے جو نظریے کو صحیح طور پر سمجھنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

کلمہ لا الہ الا اللہ محض ایک رسمی جملہ نہیں کہ زبان سے ادا کر لیا جائے بلکہ یہ زندگی کے اندر انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ چنانچہ دنیا بھر کے مظالم صحابہ کرام پر کئے جا رہے ہیں۔ طرح طرح سے ان کو ستایا جا رہا ہے۔ لیکن اس عقیدے اور نظریے کے ساتھ ان کو ایک ایسا عشق ہو گیا ہے کہ اب کوئی بھی مشکل ان کی سد راہ نہیں بن سکتی۔

عام طور پر اس کلمہ کو ایک رسمی جملہ خیال کیا جاتا ہے اور محض زبان سے ادا کر لینے والے کو جنت کا ٹھیکیٹ تھما دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کلمہ طیبہ پورے دین کا ایک عنوان ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کسی کتاب کا عنوان چند الفاظ کا نمائندہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے ضمن میں تمام مندرجات اور تمام تفصیلات آ جاتی ہیں۔ چنانچہ کلمہ طیبہ رسول اللہ ﷺ نے قوم کے سامنے رکھا

تو اس کے نتائج بتائے کہ اگر یہ بات تم صدق دل سے کہو گے اور اس کے تقاضے پورے کرو گے تو اس کا پہلا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کلمے کی وجہ سے تم پورے عرب کے حکمراں بنو گے۔ یہ کلمہ معاشرے کے اندر ایک ایسی تبدیلی پیدا کرے گا کہ ظلم کے نظام کا خاتمہ ہو گا اور عدل کا نظام پوری عرب سوسائٹی کے اندر قائم ہو جائے گا اور دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگلے مرحلے میں جتنا بھی عجمی علاقہ ہے وہ تمہارے نظامِ اطاعت میں آ جائے گا۔ گویا آپ نے اس کلمے کے یہ دو دنیاوی فوائد بتائے۔ جبکہ اخروی فائدہ ابدی فلاح، کامیابی و جنت اور اللہ کی رضا کی صورت میں انشاءاللہ حاصل ہو گا۔ الغرض اس مادی دنیا میں اس کلمے کا نتیجہ انقلابی تبدیلی ہے اس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دین روز اول سے ہی غلبے کا پیغام لے کر آیا ہے۔ یہ محض آخرت کی باتیں نہیں کرتا بلکہ فلاح دارین کا کامل پیکج ہے۔ یہ دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی اساس فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ اس کلمے کے نتیجے میں اولاً عرب میں پھر پورے عجم میں انقلاب آ گیا۔ یہ حقیقت مطالعہ سیرت سے ہی واشگاف ہوتی ہے۔ سیرت کو نہ سمجھنے کی صورت میں یہ ایک رسمی سا جملہ رہ جائے گا جو زبان سے ادا کر لیا جائے چنانچہ یہ کلمہ ہم ادا کرتے بھی ہیں لیکن نتائج معاشرے کے اندر پیدا نہیں ہو رہے۔ بلکہ نتائج کے حوالے سے صورت حال بالکل برعکس ہے۔ اگر یہ محض رسمی جملہ ہوتا تو سوال یہ ہے کہ ابوجہل نے کیوں نہیں ادا کیا؟ اور ابولہب اس پر مشتعل کیوں ہو گیا تھا؟ دراصل انہیں پتہ تھا کہ اس کلمے کو قبول کر لینے اور اس کو ماننے کے بعد ہمیں اپنے اقتدار سے علیحدہ ہونا پڑے گا ورنہ ابولہب کو اپنے بھتیجے سے کوئی ذاتی دشمنی نہ تھی بلکہ ابولہب کو تو آپؐ سے اتنا دلی تعلق تھا کہ اس نے آپؐ کی پیدائش کے بعد اس لونڈی (ثویبہ) کو آزاد کر دیا جس نے چند گھونٹ آپ کو دودھ پلایا کہ اب یہ نامناسب ہے کہ میری غلامی میں رہے کیونکہ اس نے میرے بھتیجے کو دودھ پلایا ہے۔ گویا شخصی تعلق تو موجود ہے۔ لیکن جب نظریے کی بات آئی اور اس پر رسول اللہ نے جب کوئی مصالحت نہیں کی تو نتیجہ یہ نکلا کہ آپؐ کی سب سے پہلی لڑائی آپؐ کے اپنے خاندان سے ہوئی۔ اس سے ہمیں سمجھ میں آتا ہے کہ ایک اعلیٰ نظریہ ایسی بنیادی تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ اس

کے نتیجے میں خاندان کے مقتدر بزرگ تک مخالف ہو جاتے ہیں۔

پھر رسول اللہؐ نے محض نظریہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نظریہ پہ جماعت سازی کی اور اس جماعت کی تربیت پہ بھرپور توجہ فرمائی۔ آپ کی تربیت میں رہنے والے لوگوں کو ہم صحابہ کے نام سے جانتے ہیں صحابی کا مطلب ہی یہی ہے کہ آپ کی تربیت اور صحبت سے مستفید ہوا ہے۔ آپ نے اس جماعت کی عقلی تربیت کرتے ہوئے اپنی انقلابی روح ان میں منتقل فرمائی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کے دنیا سے چلے جانے کے بعد باوجود نہ صرف وہ انقلابی روح قائم رہی بلکہ آپ کی بعثت کے مقاصد کی تکمیل ہوئی یعنی قیصر وکسریٰ کے ظالمانہ نظاموں کو اسی تربیت یافتہ جماعت نے شکست دی اور قرآن کا نظام قائم کیا اور اسے احسن طریقے سے چلایا۔

اس تربیت و تنظیم کے بعد رسول اللہؐ نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ کسی بھی صورت نظریے پر مصالحت نہیں ہو سکتی۔ خواہ کتنے ہی مسائل اور مشکلات آ جائیں۔ اس کیلئے وطن چھوڑنا پڑ جائے اور قربانیوں کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ قائم کرنا ضروری ہو جائے۔

## خلاصۂ کلام:

الغرض قرآن حکیم کو سمجھنے اور اس پر عمل کیلئے مطالعہ سیرت ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے جس سے قطع تعلق کیلئے معاشرے کے اندر بہت سے فاسد افکار کام کر رہے ہیں۔ انکار سنت وحدیث کا نظریہ ہو یا دین کو رسمی بنانے کا رویہ یا جماعت صحابہ سے انحراف کا فکر، ان تمام صورتوں کا ایک ہی نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے کے اندر دین کے اجتماعی راستے کو مسدود کر دیا جائے۔ یوں دین کا مقصد صرف اور صرف لوگوں کو کچھ کہانیاں سنانا اور کچھ باتوں پر اجر وثواب کی تلقین کرنا رہ جائے۔ لیکن معاشرتی زندگی میں جب تک دین کا عملی کردار زندہ نہیں ہوگا اس وقت تک معاشرے کے اندر دین غالب نہیں ہو سکتا۔ دین کے غالب تصور کیلئے بنیادی چیز یہی ہے کہ سیرت اور سیرت پر خیر القرون کا جو مزاج بنا تھا اس کا احیاء کیا جائے۔ اس کے بغیر معاشرے کے اندر دین کی مغلوب حیثیت ختم نہیں کی جا سکتی۔

**و آخر دعونا ان الحمد لله رب العالمين**

# شیخ الہندؒ شخصیت و کردار اور مقام

(اہل علم و دانش کی نظر میں)

شیخ الہند حضرت مولٰنا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کا سنِ ولادت ۱۸۵۱ء ہے۔ حضرت شیخ الہند جب پیدا ہوئے تو انیسویں صدی عیسوی کا نصف اول ختم ہو چکا تھا۔ یہ وقت برعظیم ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ ایشیا، افریقہ اور عالم اسلام کی تاریخ کا بڑا ہی سنگین اور نازک وقت تھا۔

مغرب کی سامراجی طاقتیں جن میں برطانیہ پیش پیش تھا کم وبیش تمام ایشیاء اور افریقہ کے ملکوں پر غالب آ چکی تھیں اور ان کا استعماری و استحصالی پنجہ دنیا بھر کے غریب عوام کے جسموں پر گڑ چکا تھا۔ ہندوستان کا وسیع و عریض خطہ خیبر سے راس کماری اور کشمیر سے خلیج بنگال تک انگریز سامراج کے زیر نگیں آ چکا تھا اور دھلی کا آخری مسلمان تاجدار بہادر شاہ ظفر فرنگ کی بالادستی کا شکار ہو چکا تھا۔

ترکوں کی عثمانی خلافت محض بے روح لاش تھی اور ۱۸۳۱ء میں الصدر الحمید شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے سرپرستی میں چلنے والی عسکری جماعت کی بالاکوٹ میں شہادت کے بعد اسلام کے مستقبل کی پیشین گوئی کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ کیونکہ اس مضبوط جماعت کی فکری قیادت جلا وطن ہوئی اور عسکری قیادت (حضرت شاہ اسماعیل شہید اور امیر شہید سید احمد رحمۃ اللہ) شہید ہو جاتی ہے۔ جبکہ عسکری قیادت کی تیسری شخصیت مولانا عبدالحی پہلے ہی وفات پا جاتے ہیں۔

شیخ الہند کی عمر ابھی بمشکل ۶۔۷ سال کی ہوئی ہوگی کہ ۱۸۵۷ء کا وہ معرکہ برعظیم ہند میں پیش آ گیا جسے انگریزوں کے خلاف پورے ہندوستان کی آخری مسلح جنگ آزادی کہا جانا چاہیئے۔ اس جنگ میں اہل ہند کو ناکامی ہوئی انگریز اسی فتح کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سامراجی

طاقت بن گئے جن کی حکومت اور تسلط کا سب سے وسیع دائرہ مسلمان ممالک بنے۔

اس شکست خوردہ ماحول میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا بچپن بسر ہوا۔ اس نوعمر نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے چاروں طرف انگریزی استبداد کا جابرانہ اور قاہرانہ جاہ وجلال دیکھا، جس کے ظلم و جبر اور استحصال تلے ایک طرف مسلمان دنیا کراہ رہی تھی تو دوسری طرف ہندوستان ایشیاء اور افریقہ کے بہت سے حصوں کے عوام سسکیاں بھر رہے تھے۔

حضرت شیخ الہند کو حاجی امداد اللہ مہاجر مکی مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہم اللہ جیسی ہستیوں کی تربیت اور شاگردی نصیب ہوئی۔ بالخصوص حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت نے اس نوخیز محمود حسن کو علم وعمل کا آفتاب اور انقلاب کے بین الاقوامی منصوبہ کا محرک وداعی بنایا اور ساتھ ہی اپنی سیاسی فکر اور منصوبہ کا جانشین بنایا استاد محترم نے ولی اللّٰہی تحریک انقلاب و جہاد کے تمام اسرار ورموز اور تمام منصوبے شاگرد کو منتقل کر دیئے۔

اس تاریخی تسلسل کے ساتھ مل جانے کے بعد حضرت شیخ الہند نے ۱۸۷۸ء میں ''ثمرۃ التربیت'' کے نام سے اور ۱۹۰۹ء میں ''جمعیۃ الانصار'' کے نام سے تنظیمیں قائم کیں۔ اس کے بعد ''تحریک ریشمی رومال'' کا انقلابی منصوبہ بنایا۔ اسی تحریک کی جدوجہد سے جمعیت علماء ہند معرض وجود میں آئی اور خود حضرت شیخ الہند شریف مکہ کی غداری کی وجہ سے حجاز مقدس سے گرفتار ہو کر مالٹا قید کر دیئے جاتے ہیں۔

رہائی کے بعد حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ علیہ ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو رحلت فرما جاتے ہیں اور عالم اسلام عموماً اور برعظیم ہند خصوصاً ماتم کدہ بن جاتا ہے۔

زیر نظر مضمون میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے بارے یہ دیکھنا ہے کہ برعظیم ہند کے دانشور حضرت شیخ الہند کو کیا سمجھتے تھے اور ہماری ملی اور قومی تاریخ میں ان کی کیا اہمیت ہے؟ اور ہم ان سے کیا راہنمائی لے سکتے ہیں؟

(۱) فکر ولی اللہی کے امین امام الانقلاب مولنا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ ''میں نے حضرت شیخ الہند سے شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم کی کتاب ''حجۃ الاسلام'' پڑھی۔ کتاب پڑھتے پڑھتے کبھی کبھی میں یوں محسوس کرتا جیسے علم اور ایمان میرے دل میں اوپر سے نازل ہو رہا ہے۔ حضرت شیخ الہند کی ذات اقدس کے متعلق میرا یہ عقیدہ ہے کہ وہ فطرتاً بڑے ذکی اور ذہین تھے۔ موصوف کا شمار ان بزرگوں میں سے ہوسکتا ہے جنہیں امام ولی اللہ کی اصطلاح میں ''مفہمین'' کہا جاتا ہے۔ آپ اپنے استاد (حضرت نانوتوی) سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور ان کی متابعت میں ہر دم کوشاں رہتے۔ آپ کو شیخ الاسلام مولانا قاسم (نانوتوی) سے تواضع اور انکسار کی نسبت تھی۔ اسی نسبت کو امام ولی اللہ نے اپنی کتابوں میں ''نسبت اہل بیت'' کا نام دیا ہے''۔

بحوالہ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۲۰۴ (حواشی)

(۲) ولی اللہی تحریک میں حضرت شیخ الہند کا کیا مقام تھا؟ مولانا سندھی لکھتے ہیں کہ ''حزب ولی اللہ کا دوسرا دور مولانا محمد اسحاق دہلوی نے ۱۲۴۶ھ میں شروع کیا تھا اور ۱۳۳۹ھ یعنی ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ کی وفات پر یہ دور ختم ہوگیا۔ یہاں سے ہم تیسرے دور کی ابتداء مانتے ہیں۔ چنانچہ حزب ولی اللہ کے تیسرے دور کے اساسی اصول (جو حضرت شیخ الہند کے تلقین کردہ ہیں) ہمارے نزدیک حسب ذیل ہیں۔

۱ مولانا شیخ الہند نے امام ولی اللہ کی حکمت عملی پڑھانا ضروری قرار دیا۔ اس سے ہم ایک خاص نتیجہ نکالتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ امام ولی اللہ کی فلاسفی کو ہم اپنی مستقل پارٹی کا اساسی اصول بناتے ہیں۔ امام ولی اللہ کی فلاسفی غیر مسلم ہندوستانی کو بھی اپنے ساتھ لے سکتی ہے۔ نیز یہ یورپین ازم کی لادینیت کو فنا کر سکتی ہے۔ پھر اس فلاسفی نے اقتصادیات کے متعلق جو اصول سمجھائے ہیں۔ اس کی بناء پر یہ تمام دنیا پر تفوق حاصل کر سکتی ہے۔

۲ مولانا شیخ الہند نے علی گڑھ کالج کے انقلابی عنصر کو اپنی تحریک میں شامل کر لیا تھا ان

کے پارٹی پروگرام چلانے والے ایک طرف (مفتی اعظم) مولانا کفایت اللہ اور (شیخ الاسلام) مولانا حسین احمد (مدنی) تھے تو ان کے ساتھ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا محمد علی جوہر مساوی درجہ پر شریک تھے۔ مولانا شیخ الہند کے اس اقدام سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہم ''یورپین ازم'' کو اپنی پارٹی کے مستقل پروگرام میں داخل کرتے ہیں۔

۳۔ مولانا شیخ الہند انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہو گئے تھے اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ عدم تشدد کی پالیسی سے ڈومینین اسٹیٹس حاصل کیا جائے۔

حزب ولی اللہ کے تیسرے دور کیلئے ہم جو پروگرام تجویز کرتے ہیں، ہمارے نزدیک اس کے یہی تین اصول ہیں۔ جس طرح پہلے دور کے خاتمہ پر اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد اسماعیل شہید اور ان کے رفقاء کے کارناموں سے ولی اللہی تحریک کو زندگی بخشی، ہم امید کرتے ہیں کہ دوسرے دور میں مولانا شیخ الہند اور ان کے مشائخ نے جو خدمات سرانجام دی ہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو قبول فرمائے گا۔ ان کے عزائم میں اس قدر برکت نازل کرے گا کہ امام ولی اللہ کی تحریک اپنے اس تیسرے دور میں ہندوستان کی اصلاح کر کے اسے اس منزل پر پہنچا دے گی کہ وہ دنیا کی راہنمائی کا ذریعہ بن سکے'' (بحوالہ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۱۳ تا ۱۱۵)

(۳) برصغیر کی میدان سیاست میں حضرت شیخ الہند کا مقام، ان کا نام اور کام زندہ رکھنے کی اہمیت بتاتے ہوئے حکمت ولی اللہی کے نکتہ شناس مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ ''ہم ہندوستانی سیاست کے اس دور کو جو رولیٹ ایکٹ کی ایجی ٹیشن سے شروع ہوا، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا دور مانتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر گورنمنٹ شیخ الہند کی کاروائیوں سے مطلع نہ ہوتی تو نہ رولیٹ کمیشن بیٹھتا نہ کانگریس کی تیز گام پارٹی کو اسطرح ترقی کا موقع ملتا۔

ہماری دماغی تکلیف انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے عقل مند اور آگے بڑھ کر کام کرنے والے نوجوان شیخ الہند کا ذکر تک بھولتے جا رہے ہیں ہمیں ڈر ہے کہ اس

سے ہم ہندوستان کے میدان سیاست سے بالتدریج پسپائی پر مجبور ہوتے جائیں گے''۔

(بحوالہ خطبات ومقالہ مولانا سندھی ص۲۰۵،۲۰۶)

(۴) امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں ہم نہایت بلند آہنگی کے ساتھ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی مرشد نما بزرگ علمی.....(مقام) رکھنے والا استاد موت کے منہ میں جانے کیلئے آمادہ نہیں ہے تو اسے جماعت کی سرداری سے مستعفیٰ ہو جانا چاہیئے۔ ہمارے استاد حضرت مولانا محمود حسن ہمارے بزرگوں میں تیسرے طبقے کے آدمی ہیں پہلے طبقے کے آدمی وہ لوگ تھے جو مولانا گنگوھی کے طرز کے تھے۔ مولانا شیخ الہند دونوں جماعتوں سے پیچھے کی جماعت کے تھے۔ ہم نے ان کو موت سے اتنا بے خوف دیکھا کہ ہم دنیا کے کسی انقلابی کو برابر نہیں مان سکتے۔ اس لئے ہمارے طبیعت میں فخر ہے کہ ہمارا استاد دنیا کا سب سے زیادہ موت سے بے خوف بزرگ تھا۔ جس جماعت کا رہنما ایسا ہوا اور جس کے نوجوان افراد ایسے ہوں جیسے ہم نے دیکھے وہ دنیا میں ناکام نہیں رہ سکتے مگر شرط یہ ہے کہ موت سے ڈرانے والے آدمیوں کو جماعت کی رکنیت سے قطعاً خارج کر دیا جائے۔

ہمارے استاد جہاد کی تحریک کے رہنما تھے ہماری اس جماعت کے سب آدمی اس چیز کو جانتے ہیں حتیٰ کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی سورۃ براۃ کی کسی آیت کی تفسیر میں اشارہ کیا ہے کہ انہوں نے فلاں سن میں علماء کو دعوت جہاد دینی شروع کی تو سوائے مولانا کے اس تحریک کا کہیں سے جواب نہ ملا۔ یہ اتنی صاف بات ہے کہ مولانا ابوالکلام بھی جو دوسری جماعت سے تعلق رکھتے تھے اسے جانتے ہیں۔ اسی طرح علی گڑھ کی جماعت کے لوگ بھی اسے جانتے ہیں۔

(بحوالہ شعور انقلاب ص۱۵۴)

(۵) مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ حضرت شیخ الہند کے تبحر علمی کے حوالے سے ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ کی تفسیر پڑھی۔ نیز جاراللہ زمخشری متوفی

۵۳۸ھ کی تفسیر کا مطالعہ کیا۔اس کے علاوہ معالم التنزیل از ابومحمد حسین بن مسعود فراء بغوی متوفی ۵۱۰ھ اور تفسیر حافظ عماد الدین ابوالفدا اسماعیل بن عمر المعروف بہ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ بھی پڑھی ۔ان سب تفسیروں کے ذریعہ ہم نے قرآن کو سمجھنے کی اپنی استطاعت کے مطابق پوری کوشش کی۔ لیکن سوائے تحیر کے ہمیں کچھ نصیب نہیں ہوا۔ اگر زمانہ طالب علمی میں ہم نے نجم الائمہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ سے چند آیتوں کی تفسیر جو کتابوں میں نہیں ملتی، نہ سنی ہوتی اور وہ ہمارے لئے اطمینان کا ذریعہ نہ بنتی۔ نیز شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بعض تفسیری جملے ہم نے نہ پڑھے ہوتے تو قدماء کی ان تفسیروں کو پڑھ ہم علم تفسیر کے حصول سے قطعاً مایوس ہو جاتے۔

(بحوالہ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص ۵۳)

(۶) مولانا عبید اللہ سندھی حضرت شیخ الہند کا ولی اللہی فلاسفی میں مقام متعین فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ حضرت مولانا شیخ الہند سے اپنا تعلق واضح کر دوں۔ غالباً پچاس برس سے زیادہ عرصہ گذرا کہ میں نے بتوفیقہ تعالیٰ مدرسہ دیوبند کی طالب علمی سے فارغ ہو کر امام ولی اللہ کی حکمت و سیاست کے تدریجی مطالعہ کو اپنا مقصد حیات بنایا۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس سارے سفر میں میری رہنمائی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ارشاد سے ہوتی رہی۔

اس میں مبالغہ نہ سمجھا جائے کہ ہمیں حضرت شیخ الہند کے علمی مقام کی حقیقت اس کے بعد کسی قدر نظر آنے لگی۔ وہ بظاہر تو قاسمی سیرت کے نمونہ تھے مگر باطن میں امام ولی اللہ کی حکمت کے مترجم نظر آنے لگے۔ دیکھئے شیخ الہند اپنے موضح فرقان کے مقدمہ میں امام ولی اللہ کا نام کس کس مزے سے لیتے ہیں۔

''حجۃ اللہ علی العالمین شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ''

(بحوالہ خطبات و مقالات ص ۲۳۷)

(۷) شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الہند کی زندگی پر تبصرہ

کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''مولانا کو قدرت کی فیاضیوں نے ایک ایسا دل دیا تھا جس کی وسعت سات سمندروں سے کہیں زیادہ تھی، اقالیم سبعہ اس کے ایک زاویہ میں بھی اپنا پتہ بتلا نہ سکتی تھیں۔

اس نے بحر امدادی (حاجی امداد اللہ مہاجر مکی) سے فیوضات حاصل کئے مگر ڈکار نہ لی، اس نے قاسمی (حضرت نانوتوی) نہریں پی ڈالیں مگر ہضم کر گیا، اس نے رشیدی (امام ربانی حضرت گنگوہی) گھٹاؤں اور دھواں دھار بارشوں کو چوس لیا مگر کبھی بے اختیار نہ ہوا۔ دعویٰ نہ کیا، شطحیات نہ سنائیں، استقامت سے نہ ہٹا، شریعت کو نہ چھوڑا، عشق میں گھل کر لکڑی ہو گیا مگر دم نہ مارا۔

روحانیت کی بھینی بھینی باد صبا اس کے سویدا اور دماغ میں گونجتی ہوئی مخمور کرتی رہتی تھیں۔ مگر وہ دائرہ تمکین سے باہر نہ ہوتا تھا۔ نسبت چشتیہ صابریہ کی روشن اور اغیار سوز بجلی اس کے اطراف و جوانب اور اعضاء رئیسہ کو سوخت کرتی رہتی تھی مگر مثل شمع سوزاں کبھی اف نہ کرتا تھا، طریقت کے خوش آئند احوال اس پر متجلی ہوتے تھے، مگر کبھی آواز ادنیٰ لوگوں کو سننے نہ دیتا تھا۔

علوم ظاہریہ میں بھی باوجود مجدد حدیث وفقہ وامام تفسیر وکلام وغیرہ ہونے کے کبھی اپنے آپ کو دفتر علماء میں شمار نہ ہونے دیا آپ کی کسی حالت اور کسی عملی کاروائی سے کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اپنے آپ کو عالم اور ہادیٔ خلق یکتائے زمانہ شمار کرتا ہے''۔ (بحوالہ اسیر مالٹا ص ۶۴ ۷)

قدرت کی فیاضیوں میں سے ایک یہ بھی بڑی فیاضی تھی کہ مولانا کے قلب و دماغ میں اسلامی ہمدردی اور انسانی غیرت، مذہبی حمیت، قومی جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے تھے۔ وہ فقط مدرسہ نشین یا خانقاہی بزرگ حضرات کی سی ہمت پر اکتفانہ کر سکتے تھے، ان کی ہمت مردانہ ان کو چین نہ لینے دیتی تھی ان کو قومی جذبات ہر وقت بیقرار رکھتے تھے۔ ان کی مذہبی حمیت ان کیلئے تمام مصائب سہل کر دیتی تھی ان کی انسانی غیرت اغیار سے جوڑتی اور نااہل اپنوں سے توڑتی رہتی تھی، ان کی اسلامی اور وطنی ہمدردی ان کو کبھی اپنے سن وسال، ضعیف العمری اور امراض مزمنہ کا خیال بھی نہ لانے دیتی تھی ان کو اس راہ میں نہ عزت کا خیال تھا نہ راحت کا نہ عزیز واقارب کی فکر تھی نہ

مال ودولت کی۔ (بحوالہ ایضاً ص۹)

(۸) تحریک شیخ الہند کے ممتاز رکن تحریک آزادی کے راہنما امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اس تمہید کے بعد میں بالکل آمادہ تھا کہ مقاصد ومطالب کا سفر شروع کروں، لیکن اچانک ایک غمگین حادثہ کی یاد نے میرے قدم روک دیئے۔ آپ کی اس جمعیۃ کا گذشتہ اجلاس مجمع علماء ہند کے جس بزرگ ومحترم وجود کی رہنمائی وصدارت میں منعقد ہوا تھا، آج وہ ہم میں نظر نہیں آتا اور اس کی موجودگی کی برکتوں سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔ میرا اشارہ حضرت مولانا محمود حسن کی ذات گرامی کی جانب ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ آج آپ میں سے ہر فرد کو ان کی ان کی یاد دعوت غم دے رہی ہوگی۔ ان کی وفات بلاشبہ ایک قومی ماتم ہے اور ہم سب کو ان کی عزت میں چند لمحے کیلئے رک جانا چاہیئے۔

حضرات! مولانا مرحوم ہندوستان کے گذشتہ دور کے علماء کی آخری یادگار تھے ان کی زندگی اس عہد حرمان وفقدان میں علماء حق کے اوصاف وفضائل کا بہترین نمونہ تھی۔ ان کا آخری زمانہ جن اعمال حقہ میں بسر ہوا وہ علماء ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ستر برس کی عمر میں جب ان کا قد ان کے دل کی طرح اللہ کے آگے جھک چکا تھا۔ عین جوار حرم میں گرفتار کئے گئے اور کامل تین سال (اور سات مہینے) تک جزیرہ مالٹا میں نظر بند رہے، یہ انہیں صرف اس لئے برداشت کرنی پڑی کہ اسلام اور ملت اسلام کی تباہی وبربادی پر ان کا خدا پرست دل صبر نہ کر سکا اور انہوں نے اعدائے حق کی مرضات واہوا کی تسلیم واطاعت سے مردانہ وار انکار کر دیا۔ فی الحقیقت انہوں نے علماء حق وسلف کی سنت زندہ کر دی اور علماء ہند کیلئے اپنی سنت حسنہ یادگار چھوڑ گئے۔ وہ اگر چہ اب ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کی روح موجود ہے اور اس کیلئے جسم کیطرح موت نہیں۔

(بحوالہ خطبات جمعیت علماء ہند ص۱۳۴)

(۹) مشہور صوفی بزرگ مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا محمود

حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عجیب ہی ذات تھی۔ مدعیان محبت نے تو مولانا کو پہچانا ہی نہیں اور اس نہ پہچاننے کی وجہ سے وہ شیخ العالم کو شیخ الہند کہتے ہیں ہمارے اعتقاد میں تو وہ شیخ الہند والسند والعرب والعجم ہیں۔ (بحوالہ افاضات یومیہ ج۴ ص۵۸۴)

(۱۰) برصغیر پاک و ہند کے تحریکات آزادی اور رشد و ہدایت کے عظیم مرکز خانقاہ عالیہ رحیمیہ رائے پور کے دوسرے سالار اور مجاہدین آزادی کے سرپرست قطب الاقطاب حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ''حضرت عالی رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعتوں میں بڑی یکسانیت تھی''۔

اس کی وضاحت شیخ التفسیر مولانا مفتی عبدالخالق آزاد یوں کرتے ہیں ''اور کیوں نہ ہو؟ ہزارہ دوم میں تجدیدی کام کی زیب و زینت کے مشن پر دونوں ایک نظر آتے ہیں اور یوں اپنے مشائخ کے نقش قدم پر ہمہ جہتی پہلو سے کام کرتے ہیں۔ ان دونوں کی منفرد حیثیت سامنے آتی ہے۔ ایک طرف دین کی جامعیت مدنظر رکھ کر، شریعت، طریقت اور سیاست، ان تینوں شعبوں کے تقاضے پورے کرنا، دوسری طرف اس خطے کے مظلوم انسانوں کو انگریز سامراج کے ظالمانہ غلبہ اور تسلط سے آزادی دلانے اور قومی و اجتماعی تشکیل نو کیلئے کردار ادا کرنے میں دونوں یکساں فکر و عمل کے داعی، اور جدوجہد کرنے والے نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے ان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی گہری محبت موجود تھی''۔

(بحوالہ مجلّہ عزم نمبر۱۶۶ ص۱۹)

(۱۱) مولانا سید اصغر حسین عرف حضرت میاں فرماتے ہیں کہ ''اس سلسلے میں آپ (شیخ الہند) کا کمال وہ ہمت عالی اور وہ بلند حوصلہ ہے جس کی نظیر نایاب ہے، درس نظامی کا ایک سادہ مدرس ایک مدرسہ میں چٹائی پر بیٹھا ہوا غریب اور شکستہ حال طلباء کو پڑھا رہا ہے۔ نہ عظمت ہے، نہ شان و شوکت، مگر اس کی نظر دنیا کے گوشہ گوشہ پر ہے۔ اس کے دل میں ہر پسماندہ قوم کا درد

ہے، جگر میں شعلہ ہے جو ہر ایک سامراج کو جھلس دینا چاہتا ہے۔ وہ نہتا ہے غیر مسلح، جنگ کا کوئی سامان اس کے پاس نہیں، مگر وہ اس برطانیہ عظمیٰ کی مسلح فوجوں سے ٹکرا رہا ہے۔ جس کی شہنشاہیت کی حدود میں سورج غروب نہیں ہوتا۔ اس کا نصب العین وطن عزیز کا مکمل استخلاص ہے۔ آزادی کامل سے نیچے آزادی کا کوئی بھی درجہ اس کیلئے جاذب توجہ نہیں، اقلیت و اکثریت کا کوئی سوال اس کے سامنے نہیں''۔ (بحوالہ اسیران مالٹا ص ۶۵، ۶۶)

(۱۲) دارالعلوم دیوبند کے تیسرے مہتمم حکیم الاسلام قاری محمد طیب مرحوم فرماتے ہیں کہ ''آپ (حضرت شیخ الہند) حضرت نانوتوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور حضرت کے بعد قاسمی علوم کا جو فیضان عالم میں آپ کی ذات سے ہوا اس کی نظیر دوسرے تلامذہ میں نہیں ملتی۔ اپنے استاد میں فانی استاد کے علم میں غریق تھے۔ دین کے ہر دائرے میں آپ کی خدمات نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ درس و تصنیف، ارشاد و تلقین اور جذبۂ جہاد وغیرہ میں آپ کی خاموش خدمتیں زبان حال سے گویا ہیں۔ آپ اپنے استاد حضرت نانوتوی کے علوم کے امین اور خزینہ دار تھے ..... آپ نے دارالعلوم دیوبند میں چالیس برس تک مسلسل درس حدیث دے کر ۱۸۶۰ علے استعداد کے صاحب طرز عالم دین، فاضل علوم اور ماہرین فنون پیدا کئے۔ آپ کا درس حدیث اس دور میں امتیازی شان رکھتا تھا اور مرجع علماء تھا۔ آپ کو علماء عصر نے ''محدث عصر'' تسلیم کیا۔ بیعت و ارشاد کے راستہ سے ہزار ہا تشنگان معرفت کو عارف باللہ بنایا اور آپ کا سلسلۂ طریقت ہندوستان سے گذر کر افغانستان اور عرب تک پہنچا۔ متعدد علمی تصانیف آپ نے ترکہ میں چھوڑیں۔

ہندوستان کو غیر ملکیوں سے آزاد کرانے کیلئے ایک زبردست انقلابی تحریک چلائی جس کو رولیٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ''ریشمی رومال کی تحریک'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ تحریک بہت زیادہ مؤثر تھی۔ مگر راز میں نہ رہ سکی اور ناکام ہوگئی۔ پھر بھی اس کی آگ جن کے دلوں میں لگی ہوئی تھی انہوں نے آئندہ کام کر کے ہندوستان کو آزاد کرایا۔ آپ تقریباً پانچ برس مالٹا میں قید رہے۔

(بحوالہ کتاب تاریخ دارالعلوم دیوبند، قاری محمد طیب قاسمی ص۵۴،۵۶)

(۱۳) حضرت مولانا قاری محمد طیب لکھتے ہیں کہ جماعت دارالعلوم اور علماء میں ہزاروں ہزار نکلیں گے جنہوں نے اس حکمت سے سبق لیا۔ لیکن خصوصیت سے جن حضرات کو اس حکمت سے خاص مناسبت اور گرویدگی تھی ان میں پہلے طبقے میں حضرت اقدس مرشدی ومرشد عالم حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کے درس حدیث کا طغرائے امتیاز ہی یہ علوم قاسمیہ تھے۔ آپ اس حکمت کا ایک نہایت گہرا ظرف اور اس کے اولین ترجمان تھے انہیں ان علوم ومعارف کے لحاظ سے قاسم ثانی کہا جانا ایک واقعی حقیقت ہے۔

حسب روایت حضرت مولانا حبیب الرحمان عثمانی رحمۃ اللہ علیہ آپ نے حضرت والا کی بعض ادق کتابیں جیسے آب حیات وغیرہ حضرت والا سے درسأ درسأ پڑھی تھیں اس لئے ان بدیہات قاسمیہ کی جو ترجمانی آپ فرماسکتے تھے وہ اوروں سے ممکن نہ تھی۔ (حکمت قاسمیہ ص۳۰)

(۱۴) ترجمان فکر ولی اللہی مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اپنے عہد کے صرف ایک نامور محدث نہیں تھے بلکہ عالم اسلام کے بلند پایہ مفکر بھی تھے۔ جن کا دل ودماغ اسلام کو دنیا کی عظیم ترین طاقت بنانے اور ہندوستان میں ایک اسلامی انقلاب برپا کرنے کی فکر میں ہر وقت غلطاں وپیچاں رہتا تھا۔

(بحوالہ مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد ص۲۹)

(۱۵) مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم فرماتے ہیں اصل بات یہ ہے کہ علماء کے ہمیشہ دو طبقے رہے ہیں ایک وہ جو درس وافتاء کی چہار دیواری اور ظواہر احکام کے حصار میں مقید ومحدود ہے اور عوامی زندگی سے کبھی کوئی واسطہ نہ رکھا بلکہ ملکی وقومی مسائل کو سیاست کا نام دے کر ان سے مجتنب اور دامن کشاں رہے ان کے برخلاف دوسرا طبقہ وہ تھا جو علم وفضل اور تقویٰ وطہارت کے اعلیٰ اوصاف سے مزین ہونے کے ساتھ ملکی وقومی مسائل ومعاملات اور عوام کی زندگی سے

دلچسپی لینے کو اپنا دینی وظیفہ سمجھتا تھا۔ ظاہر ہے ایک انسان سب سے الگ تھلک گوشۂ تنہائی میں زندگی بسر کرتا ہے تو معاشرتی مسائل کے بارے میں اس کا نقطہ نظر تنگ اور کوتاہ بینی کا صید زبوں ہوتا ہے لیکن جو شخص سوشل لائف کا عادی ہے اس کے نقطہ نظر میں توسع ہوتا ہے۔ جسے عام اصطلاح میں روشن خیالی کہتے ہیں یہی وہ فرق و امتیاز ہے جو معاشرتی مسائل کے متعلق علماء کے مذکورہ بالا دو طبقوں کے طریق فکر و نقطہ نظر میں پایا جاتا ہے۔

حضرت شیخ الہند نے مکتبۂ فکر ولی اللہی کے حقیقی اور اعلیٰ ترجمان کی حیثیت سے ملک کی سیاست سے دلچسپی لینی شروع کی اور استخلاص وطن کی غرض سے ایک عظیم انقلابی تحریک کی تاسیس کی تو ظاہر ہے ایسی کوئی تحریک برادران وطن کے اشتراک و تعاون کے بغیر پروان نہیں چڑھ سکتی تھی۔ چنانچہ آپ نے یہ تعاون حاصل کیا اور اس میں اپنی وسعت قلب کا اظہار یہاں تک فرمایا کہ کابل میں جو عارضی حکومت اس تحریک کے ماتحت بنی اس کا صدر راجہ مہندر پرتاپ کو بنایا گیا۔ ارباب مدرسہ و خانقاہ کی فطرت و جبلت کے برخلاف ایک عظیم انقلابی راہنما ہونے کے باعث حضرت شیخ الہند کے فکر و نظر میں کتنا توسع پیدا ہو گیا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب کسی نے ایک مرتبہ کہا کہ ''حضرت آپ الہلال اس ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں حالانکہ اس میں تصاویر ہوتی ہیں اور اس کا ایڈیٹر (مولانا ابوالکلام آزاد) متشرع بھی نہیں ہے، تو حضرت شیخ الہند نے فوراً یہ شعر پڑھا

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

میں الہلال کیوں نہ پڑھوں کہ یہ پہلا رسالہ ہے جس نے ہم کو جہاد کا سبق یاد دلایا ہے۔ جو ہمارا فریضہ ہے اور ہم اسے بھول چکے تھے۔

ایک مرتبہ اسی قسم کا تذکرہ تھا کہ حضرت شیخ الہند نے ذوق کا یہ شعر کسی قدر تصرف کے

ساتھ پڑھا

ذوق جو مدرسوں کے بگڑے ہوئے ہیں ملا
مالٹا میں انہیں لے آؤ سنور جائیں گے

(۱۶) امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد و خادم اور مرتب تفسیر المقام المحمود مولانا عبداللہ لغاری فرماتے ہیں کہ ''ہمارا اعتقاد ہے کہ مولانا شیخ الہند کی تحریک سے ہندوستان آزاد ہوا ہے۔ اس تحریک کو چلانے والے مولانا عبیداللہ سندھی تھے۔ مہاتما گاندھی اسی تحریک سے پیدا ہوئے..... حالانکہ رولیٹ ایکٹ شائع ہونے سے قبل گاندھی جی انگریزی لشکر جمع کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور خلوص دل سے گورنمنٹ کی خدمت میں لگے ہوئے تھے..... یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ دوسری عالمگیر جنگ میں برطانیہ نے ہندوستان کو آزاد کر دیا، انڈونیشیا آزاد ہوا یہ بھی مولانا شیخ الہند اور مولانا عبیداللہ سندھی کی تحریک کے نتیجے میں۔ سرگزشت کابل ص ۴۱، ۴۲۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ ''مولانا شیخ الہند ہندوستان میں مسلمانوں کے بے تاج بادشاہ تھے اور افغانستان میں ان کا وقار تھا، ترکی ان کے اشاروں پر چلتا تھا اور ان کے خادم تمام یورپ میں انقلابی کام کر رہے تھے۔ اس بات کو وزیر اعظم انگلستان جانتا تھا اور باقی یورپ کے بادشاہ بھی مولانا شیخ الہند سے ناشناس نہ تھے۔ اس لئے مالٹا میں ان کو کپتان کے درجہ پر رکھا اور تلوار بھی عنایت کر دی۔ (بحوالہ سرگزشت کابل ص ۱۴۳)

(۱۷) جب شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ فوت ہوئے تو افغانستان کے سابق بادشاہ امیر امان اللہ خان نے مولانا عبیداللہ سندھی کے موجودگی میں تعزیتی جلسہ منعقد کیا۔ اس موقع پر اس نے خطاب کرتے ہوئے ایک جملہ کہا جو انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ جس سے تحریک شیخ الہند کے اثرات معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ''کارے کہ مولانا محمود الحسن شیخ الہند شروع کردہ بود من اورا تمام می کنم'' (جس کام کو شیخ الہند نے شروع کیا اسے میں مکمل کروں

گا)۔ (بحوالہ سرگزشت کابل ص۲۰۳)

(۱۸) تحریک شیخ الہند کے رکن اور خدائی خدمت گار تحریک کے بانی خان عبدالغفار خان لکھتے ہیں کہ مولوی فضل ربی نے دیوبند میں تعلیم حاصل کی تھی اس لئے ہم کبھی کبھار دیوبند جایا کرتے تھے۔ دیوبند کے تعلیمی ادارہ کے صدر شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب جہاں بہت بڑے عالم تھے وہاں نیک خصالی اور پاکبازی میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان سے بھی ہمارے تعلقات پیدا ہو گئے کیونکہ ان کے دل میں ملک وملت کیلئے بے حد ہمدردی ومحبت تھی اور ہم بھی اسی مرض میں مبتلا تھے وہ بھی اسی فکر میں تھے کہ یہ ملک فرنگی کی غلامی سے کیسے نجات حاصل کرے گا اور ہم بھی انہی تفکرات میں مبتلا تھے۔ (بحوالہ آپ بیتی ص۲۵)

(۱۹) جمعیت طلباء اسلام پاکستان کے سابق ناظم عمومی سید مطلوب علی زیدی فرماتے ہیں کہ ''آپ (شیخ الہند) کے افکار سے مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم محمد اجمل خان، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، نواب وقار الملک مرحوم اور مہاتما گاندھی جیسی قومی اور بین الاقوامی شخصیات نے استفادہ کیا۔

(بحوالہ شعور وآگہی ص۱۱)

(۲۰) مشہور دانشور سابق ایڈیٹر ہفت روزہ ترجمان اسلام ڈاکٹر احمد حسین کمال لکھتے ہیں کہ ''شیخ الہند جیسی ہمہ گیر شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے اور صدیوں تک اس کا فیضان جاری رہتا ہے۔ میں یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ برطانوی اور مغربی سامراج کے خلاف دنیا کی پہلی مؤثر ترین جدوجہد کے بانی شیخ الہند تھے۔

ایشیاء افریقہ اور عالم اسلام میں بیسویں صدی کے تیسرے عشرہ سے آج تک جتنی بھی سیاسی، علمی اور دینی تحریکیں برپا ہوئی ہیں ان کی تہہ میں حضرت شیخ الہند کی تحریک انقلاب کی

کارفرمائی موجود ہے۔ یہ بند دروازہ شیخ الہند نے کھولا تھا اور اگر برطانیہ عظمیٰ اور مغربی سامراج پسپا ہوتا نظر آ رہا ہے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے چرچے ہو رہے ہیں تو اس کی ابتداء حضرت شیخ الہند کی ذات سے ہی ہوئی ہے۔

رولٹ ایکٹ کا سارا پس منظر حضرت شیخ الہند کی تحریک انقلاب ہے شیخ الہند کی تحریک انقلاب نے ہندوستان سمیت ایشیاء اور عالم اسلام میں بیداری کی ایک نئی اور قومی لہر پیدا کر دی۔ برطانوی رعب داب کا طلسم پاش پاش ہو گیا تھا، خود ساختہ نبوت کا جھنڈا سرنگوں کر دیا گیا تھا۔ سنت پیغمبر کی اہمیت اجاگر ہو گئی تھی، اور مسلمان ملت کا شیرازہ ایک لڑی میں پرو دیا جانے لگا تھا جس کا اظہار تحریک خلافت کی صورت میں ہوا۔ (بحوالہ خطبات شیخ الہند ابتدائیہ ص ۳۰، ۳۱)

یہ تھے شیخ الہند اور یہ تھا ان کا مقام اور پروگرام۔ آج کے برصغیر کو شیخ الہند رحمۃ اللہ اور ان کی جماعت کے پروگرام کی از حد ضرورت ہے۔ برعظیم کے ملکوں کے عوام مختلف مسائل کا شکار ہیں اور نت نئے فتنوں میں الجھ رہے ہیں اور برصغیر کے آزاد ممالک کی آزادی کو بہت سے خطرات اور چیلنج لاحق ہیں۔

ان حالات میں اگر شیخ الہند اور ان کی جماعت کی جدوجہد اور پروگرام کو سمجھ لیا جائے اور اسلام کی اس حقیقت کو جان لیا جائے جو شیخ الہند کے منصوبہ کی روح تھی تو برعظیم کے بحرانوں پر قابو پایا جا سکتا ہے اور ان ملکوں کے عوام آزاد رہ سکتے ہیں۔ مل جل کر رہ سکتے ہیں خوشحال ہو سکتے ہیں اور مغربی سامراج کی حکمت عملیوں کے نقصانات سے بچ سکتے ہیں۔

شیخ الہند کی یہ عظیم شخصیت، تحریک اور ان کی انقلابی جماعت طاق نسیان کی نظر ہے کسی تاریخ کی کتاب میں ان کا نام تک نظر نہیں آتا۔ آخر کیوں؟ اس کا جواب واضح ہے کہ مؤرخین برصغیر نے سامراج کے زیر اثر رہ کر تاریخیں لکھیں اور پھر اس کو صحیح اور مستند تاریخ منوانے پر تل گئے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تاریخوں میں شیخ الہند اور ان کی جماعت کے آزادی اور انقلاب کے

کارنامے کیسے جگہ پا سکتے ہیں اس لئے متحدہ ہندوستان کی ہی نہیں پوری ایشیاء بلکہ افریقہ تک کی آزادی اور مغربی سامراج کے زوال میں ولی اللہی جماعت کے علماء اور بالخصوص حضرت شیخ الہند کا جو اہم اور بنیادی واصلی کردار بنتا ہے مورخین اس کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ تاریخ کے اس غبار کو چھانٹا جائے اور اس پر مستقلاً اسکالروں کی جماعت کام کرے چنانچہ احباب فکر ولی اللہی پاکستان میں اعلیٰ نصب العین کے حصول کی خاطر انہی بنیادوں پر کام کر رہے ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ سامراج زدہ حلقے سیخ پا ہیں اور اوٹ پٹانگ ہانکتے رہتے ہیں جس سے کسی صورت مرعوب نہیں ہونا چاہیئے۔

(ترتیب مفتی شہاب الدین بنگش، نوشہرہ)